امریکہ عرب تعلقات اور عالمگیریت کا چیلنج

پروفیسر ڈینیل برمبرگ/ پروفیسر سٹیون ہائیڈ مین*

۱۶/۱۵ فروری ۱۹۹۷ء کو FDPCME نے کنگ عبدالعزیز السعود فاؤنڈیشن کاسابلانکا (مراکش) میں امریکہ عرب مکالمے کے موضوع پر اپنی تیسری کانفرنس کا انعقاد کیا۔ واشنگٹن (جہاں پہلی دو کانفرنسیں منعقد ہوئی تھیں) کے بجائے عرب دنیا میں کانفرنس کا انعقاد کئی پہلوؤں سے اہمیت کا حامل ہے۔ تمام اجلاسوں میں ایک اہم موضوع "مشرق وسطی میں امریکہ کا کردار" کے حوالے سے عربوں اور امریکیوں میں پائی جانے والی وسیع خلیج تھا۔ عرب شرکا امریکہ کو علاقے میں موجود ایک منفی قوت کے طور پر دیکھ رہے تھے جبکہ امریکیوں کا خیال یہ تھا کہ امریکی خارجہ پالیسی میں مشرق وسطی نسبتاً" کم تر ترجیحات کا حامل ہے۔ انہوں نے اپنے عرب ہم منصبوں پر زور دیا کہ وہ حالیہ مسائل کی بہتر تفہیم اور حل کے لیے علاقے کے داخلی حالات پر غور کریں۔ کاسابلانکا میٹنگ میں نقطہ ہائے نظر اور رجحانات کا یہ تفاوت بہت نمایاں تھا۔

کانفرنس کے انعقاد کے لیے مقام کا انتخاب اس لیے بہت موزوں ثابت ہوا کہ اس طرح امریکی شرکاء کو عرب دنیا کی پیچیدگی اور مسائل کو زیادہ گہرائی تک سمجھنے کا موقع ملا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں مشرق وسطی میں زیادہ سے زیادہ افراد تک اپنی کوششیں پھیلانے اور ان تک رسائی حاصل کرنے کا بھی موقع ملا۔ خصوصاً" جب اس کا مقابلہ واشنگٹن جیسے خبرزدہ شہر کے اخبارات و جرائد میں ہمارے پروگراموں کی کوریج سے کیا جائے۔

مراکش جو اس وقت معاشی اصلاحات اور صنعتی ڈھانچے کی ازسرنو تعمیر کے عمل سے گذر رہا ہے، مشرق وسطی میں عالمگیریت (گلوبلائزیشن) کے تجربات کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ عالمی بنک نے اسے عرب دنیا میں ان معدودے چند مثالوں میں سے ایک قرار دیا ہے جہاں آزاد معیشت رواج پا رہی ہے۔

---

*Prof: Daniel Brumberg and Prof. Steven Heydemann, " US_ Aralb Relations and the Challenge of Globalization", The Diplomate, 2:6 (Nov. 1997). PP 26_28

(تلخیص راشد بخاری)

تاہم وہاں کے اکثر لوگ اصلاحات کے فوائد کے بارے میں متشکک ہیں۔ ان میں بے روزگاروں کی بڑی تعداد شامل ہے۔ تعلیم یافتہ نوجوان معیشت سے ریاست کی لاتعلقی پر دل گرفتگی کاشکار ہیں۔ کیونکہ اس طرح پرائیویٹ سیکٹر میں ملازمت / روز گار کی توقعات کم رہ جاتی ہیں جہاں شاید اس خصوصی قابلیت کی ضرورت نہیں ہوگی جو انہوں نے کالجوں میں حاصل کی ہے۔

بین الاقوامی معیشت میں مراکش کی شمولیت خطے کے مخصوص حالات اور خصوصیات کے تناظر میں بہت منفرد ہے۔ معاشی اعتبار سے مشرق وسطیٰ دنیا کے ساتھ زیادہ جڑا ہوا نہیں ہے اور زیادہ تر حالیہ معاشی حالات کے جواب میں معاشی علاقائیت کے لیے اس کا ردعمل مدافعانہ ہوتا ہے۔

عالمگیریت نے جسے عموماً "مغرب کی برتری" (اگر سادہ الفاظ میں امریکی فوقیت نہ کہا جائے) کے طور پر دیکھا جاتا ہے' عرب امریکہ تعلقات کے حوالے سے مباحث کو ہوا دی ہے۔ ایسے مباحث اس نقطہ نظر اور خلیج کو بڑھاوا دیتے ہیں' تاہم ہمیں امید ہے کہ اس تناظر کو ختم کرنے میں کامیاب ہوا جاسکتا ہے جس میں عالمی نظام کی طرف پیش رفت کو دیکھا جاتا ہے۔

عرب اور امریکی معاشروں کے مختلف طبقات کے نزدیک عالمگیریت کا یہ تجربہ مختلف ہے۔ اس وجہ سے ہم اس میں بہت استعداد پاتے ہیں کہ عالمگیریت کا یہ عمل طرفین کو مجبور کررہا ہے کہ وہ بین الاقوامی برادری کے ساتھ اپنے تعلقات کا ازسرنو جائزہ لیں۔ خصوصاً بین الاقوامی معیشت کے حوالے سے بین الاقوامی اور مقامی سطح پر سرحدیں اور ترجیحات بدل رہی ہیں۔ ان کے ساتھ منسلک تبدیلیاں جو بہت سے تسلیم شدہ خیالات' تفاہیم اور طور طریقوں کو متاثر کر رہی ہیں' وہ ہمارے اختیار سے باہر ہیں۔

ہمارا پہلا مقصد "شناخت" اور "منڈی" کے تعلق کا جائزہ لینا تھا۔ کئی عرب دانشوروں کے نزدیک شناخت اگر زیادہ نہیں تو کم از کم اتنی ہی اہم ہے جتنا کہ معاشی بڑھوتری' عالمی تجارت وغیرہ۔ امریکی اس بات کی برداشت یا فہم کم ہی رکھتے ہیں کہ معیشت کے ذریعے عرب یا اسلامی اقدار کا اظہار ہو۔ ان کے نزدیک معیشت کو سائنسی انداز میں طے کی گئی ترجیحات اور اصولوں کی روشنی میں آگے بڑھانا چاہیے۔ عرب دانشور فطری طور پر عالمگیریت کے بارے میں کچھ تحفظات کا شکار تھے۔ اس گروپ میں کاروباری طبقے کے لوگ شامل نہیں تھے۔ ان کی غیر حاضری سے عرب دنیا میں دانشوروں اور کاروباری طبقے کے درمیان نظریاتی اور سیاسی تفاوت واضح ہوکر سامنے آیا۔

کانفرنس سے اس بات کی بھی نشاندہی ہوئی کہ مسئلہ فلسطین' عالمگیریت کے متعلق یکساں اپروچ اپنانے میں مسلسل دشواریاں پیدا کررہا ہے۔ اکثر شرکا کے لیے یہ بات حیران کن تھی کہ محمد کیرنی عرب کی معاشی پالیسیوں پر اپنے سخت نقادوں سے جلد ہی متفق ہوگیا۔ تاہم کیرنی نے مسئلہ فلسطین کے حوالے سے اعتراضات اٹھائے۔ اس کا اصرار تھا کہ عرب معاشی پالیسیوں پر بات کرتے ہوئے اس مسئلہ سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ کچھ امریکی شرکا نے اصولی طور پر اس سے اتفاق کیا اور کچھ کے خیال میں عرب اسرائیل مسئلہ کو عرب دنیا میں ناگزیر اصلاحات کے نفاذ میں حائل نہیں ہونا چاہیے۔

آخری اجلاس میں "سیاسی اسلام" کے سوال پر مباحثہ زیادہ تر امریکیوں اور عربوں کے درمیان نہیں بلکہ عربوں اور عربوں کے درمیان تھا۔ یہ چیز امریکی شرکا کے لیے باعث حیرت تھی۔ محمد الحاکمی حامدی پر جنہوں نے طارق البشری کا مقالہ پیش کیا' عرب حقوق نسواں اور حقوق انسانی کے کارکنوں نے سوالات کی بوچھاڑ کردی۔ انہوں نے اس پر گہری تشویش کا اظہار کیا کہ ان کا پیش کردہ "لبرل ازم" غیر حقیقی (اور محض چالبازانہ) ہے۔ اس کے برعکس اس مقالہ پر امریکیوں کا ردعمل بہت مثبت تھا۔ کیونکہ ۱۹۹۵ء میں واشنگٹن کانفرنس میں انہوں نے جن (انتہا پسندانہ) خیالات کا اظہار کیا تھا' حالیہ مقالہ اس کے مقابلے میں خاصی مثبت تبدیلی کا حامل تھا۔ باقی لوگ حیران تھے کہ حامدی کا جمہوریت اور تکثیریت دونوں کا دفاع کرنا پیچیدگیوں کا باعث ہوگا۔ جیسا کہ جوش مراوک نے کہا: "میں حیران ہوں کہ ایک دن میں اور ڈان برمبرگ اسلامی جمہوریہ تیونس کے سفارت خانے کے باہر خود کو ایک پلے کارڈ اٹھائے ہوئے پائیں گے' جس پر لکھا ہوگا: الحاکی حامدی کو رہا کرو"۔

رابعہ نصیری نے اپنے ساتھیوں کی زبردست حمایت کے ساتھ کثیر شناختی اصولوں کا دفاع کیا اور اس دعویٰ کو رد کیا کہ عرب معاشرے کو لازماً" صرف ایک عرب یا مسلم تہذیبی ورثے کا اظہار کرنا چاہیے۔ حقیقتاً" ہم عالمگیریت کی تہذیبی یا ثقافتی قیمت پر امریکی عرب مباحثے کی توقع نہیں کرسکتے تھے۔ جب تک کہ شناخت کا سوال حل نہ ہوجائے یا کم از کم عرب میں اس پر بہت زیادہ بحث نہ ہو چکے۔

برہان غالیون نے ایسی مشترکہ پالیسیاں بنانے پر زور دیا جو عالمگیریت کے منفی اثرات کو کم کرسکیں۔ اکثر شرکا فوراً" ہی اس پر تیار ہوگئے کہ عرب اور تیسری دنیا کے معاشی' سیاسی' اور ثقافتی تفاوت پر بھی بات ہونی چاہیے۔ حتیٰ کہ ہمارے زیادہ قدامت پسند شرکا نے بھی غالیون کی

اس تجویز کو مکمل طور پر رد نہیں کیا کہ سیاست کو لازماً "بے مہار" معاشی طاقت کے لیے حدود کا تعین کرنا چاہیے۔ تاہم یہ سوال اپنی جگہ رہا کہ سیاست میں یہ کیسے ہوگا؟ کئی امریکی اس بات پر پریشان تھے کہ غالیون کی تجویز سے ایسی عوامی پالیسیوں کی طرف مراجعت ہوگی جن کے تحت معاشی ترقی کے اہداف خالصتاً سیاسی طور پر طے کیے جاتے ہیں۔ ایک شریک کار کا یہ کہنا تھا کہ ایسی پالیسیوں سے عرب دنیا کا مغرب پر معاشی انحصار بڑھ جائے گا۔ تاہم سماجی انصاف کے سوال کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یقیناً امریکہ میں متعدد ایسے گروہ ہیں جنہوں نے معاشی حتی کہ ثقافتی قیمت عالمگیریت کے لیے ادا کرنی پڑے گی کے متعلق جو خدشات کا اظہار کیا ہے۔

عربوں اور امریکیوں کو لازماً ایسا راستہ ڈھونڈھنا پڑے گا جو سیاسی انتخاب اور معاشی ترجیحات و توقعات، مہارت اور برابری اور اسی طرح مشترکہ شناخت اور عالمی تہذیب کے درمیان توازن قائم کرسکے۔ ان بنیادی سوالات پر مباحث کا آغاز تو اب ہوا ہے۔